Faith and Discovery
January – June 2025 Vol:3, Issue:1
ISSN(p): 3007-0643
ISSN(e): 3007-0651

وہم سے حقیقت تک: تصوف کے ذریعے خودی کی تعمیر نو

From Illusion to Reality: Reconstructing the Self through Sufism

حکیم محمد عمران اقبال
فاضل، قادر طبیہ کالج، آستانِ فضل، سرگودھا

Abstract: This research article explores the foundational principles of Sufism as established by the Quran and Sunnah, emphasizing the construction of personality through a comprehensive framework that fosters the development of balanced and virtuous individuals. These individuals are equipped to play significant roles at social, religious, spiritual, ethical, and cultural levels. The article highlights the historical impact of Sufism, particularly during its peak, when it produced exemplary personalities and influenced various societal domains, contributing to the elevation of Islamic civilization. Despite the contemporary decline in the active role of Sufism, the teachings of notable Sufi figures, such as Hazrat Zahoor Ahmad Qadri, are presented as a beacon of hope, offering innovative insights that address modern intellectual and practical needs. The article delves into the core Sufi concepts, such as the unity of existence and the transformative journey towards spiritual perfection through practices like prayer, remembrance of God, and self-reflection. It underscores the importance of recognizing the divine presence in all aspects of life and the necessity of overcoming the illusions of selfhood to achieve a deeper connection with the divine. The research concludes by advocating for a renewed understanding of Sufism that aligns with contemporary challenges, emphasizing the need for a

holistic approach to personal and spiritual development rooted in the principles of unity and divine consciousness.

Keywords: Awareness, Divine, Ethics, Personality, Rituals, Spirituality, Sufism, Transformation, Unity

تصوف قرآن اور سنت کے مستحکم اصولوں پر استوار تعمیرِ شخصیت کے ضابطے کا نام ہے۔ یہ تعمیرِ شخصیت، تشکیلِ کردار، اور انسان کے ظاہر و باطن کے ارتقاء کا وہ جامع لائحۂ عمل ہے، جس کے ذریعے ایسی متوازن اور باکردار شخصیات وجود میں آتی ہیں جو معاشرتی، سماجی، دینی، روحانی، اخلاقی اور تہذیبی سطح پر مؤثر کردار ادا کرنے کی اہل ہوتی ہیں۔ صوفیاء کرام نے ہر دور کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشرے کے اخلاقی اور روحانی وجود کی حفاظت کا اہتمام کیا، اور تصوف کے بنیادی اصولوں و تصورات کی توضیح و تشریح ہمیشہ وقت کے ذہنی تقاضوں اور عملی ضروریات کے مطابق کی۔(Varlik & Camilleri, 2022, pp. xi, 79, 95, 109)

تاریخ گواہ ہے کہ اپنے دورِ عروج میں تصوف نے نہ صرف ایسی باکمال شخصیات تیار کیں بلکہ معاشرے کی علمی، دینی، سیاسی اور مقتدر شخصیات پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے، جس کے نتیجے میں اسلامی تہذیب کو فروغ اور بلندی نصیب ہوئی (Öztürk, 2022, p. 171)۔ یہ ایک المیہ ہے کہ آج کے دور میں تصوف کم و بیش اپنے اس فعال کردار سے محروم ہو چکا ہے، تاہم ہمارے معاشرے میں ایسے افراد ہمیشہ موجود رہے ہیں جو تصوف کے اس روشن کردار کے امین اور اعمالِ صالح کی عملی تصویر بن کر سامنے آتے رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے ایک عظیم صوفی حضرت ظہور احمد قادری، بانی و مؤسس آستانہ فضل، سرگودھا، کی تعلیمات اور صوفیانہ افکار اسی سلسلۃ الذہب کی روشن کڑی ہیں۔ ان کی تصنیف 'جمال و کمال' تصوف کی تعلیمات کا ایک غیر روایتی، مگر نہایت مؤثر اور جامع بیان ہے، جو نہ صرف روایتی خانقاہی نظام میں ایک تخلیقی اضافہ ہے بلکہ دورِ حاضر کے فکری و عملی تقاضوں کا بھرپور جواب دینے کی استعداد بھی رکھتا ہے۔ آپ کے نزدیک تصوف کا بنیادی نقطہ نظر یعنی وحدت الوجود توحید الٰہی کا انتہائی وجدانی اور نادر احساس ہے جو اسرار الالٰہیہ اور علم الٰہی میں اشیا کی ماہیات اور مقتضیات کے سربستہ رازوں سے تعلق رکھتا ہے۔ (قادری، ص ۴، ۵) جب انسان اس بنیادی تصور کو سمجھ کر اپنا لیتا ہے تو وہ مجاہدات اور اخلاقی و نفسیاتی اصلاح کے ذریعے سے دو انداز

سے روحانی کمالات کی طرف بڑھتا ہے: قرب نوافل اور قرب فرائض۔ قرب نوافل میں بشری صفات زائل ہوتی ہیں اور اوصاف الٰہی حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں بندہ فاعل اور آلہ خدا ہوتا ہے جیسا کہ حدیث قرب نوافل سے واضح ہے۔ (قادری، ص٦) جب انسان ہر طرح کے نقائص سے پاک ہو کر معرفت الٰہی کا حقدار ہو جائے اور اس میں صفات الٰہیہ کا عکس پیدا ہو جائے تو وہ سر الٰہی کے مرتبے تک پہنچتا ہے۔ جب افعال صفات اور ذات کی یگانگی کا تصور قلب پر اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ ہر قسم کا تفرقہ مٹ جائے اور سالک ذات میں ایسا محو ہو جائے کہ ذات کے علاوہ اور کچھ مقصود نہ رہے تو سالک کی اس کیفیت کو وصال کہتے ہیں :

تو مباش اصلا کمال این ست وبس
تو درو گم شو وصال این است و بس
وصال این جائے کہ رفع خیال است
چو غیر از پیش بر خیزد وصال است

(عطار، ۱۴۰۳، قادری، ص۷)

انسانی ذات کی تکمیل تب ممکن ہے جب وہ اپنی ذات میں ذاتِ حق کا شعوری ادراک اور اثبات کرے۔ لیکن اس روحانی سفر کی ابتدا انسان کے اپنے ارادے سے ہوتی ہے۔ انسان کو خود پہل کرنی ہوتی ہے؛ اپنی مجازی حقیقت کو حق کے نور سے ہم آہنگ کرنے کا عمل خود اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک باطنی انقلابی عمل ہے جس میں صوفیاء کرام نے رہنمائی کے لیے وہ طریقے تجویز کیے ہیں جو قرآن و سنت کی بنیاد پر استوار ہیں۔

اس کا ایک خوبصورت عملی نمونہ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ کے تجربات میں ملتا ہے، جنہوں نے وضو اور غسل جیسے ظاہری اعمال کے ذریعے باطنی کیفیات و معاملات میں کشادگی حاصل کی (ہجویری، ۲۰۱۲، ص۱۷۰) ۔ان کا یہ تجربہ اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں ہے جس کے مطابق وضو کے دوران ایک ایک کر کے تین گرہیں کھلتی ہیں، اور تہجد (نمازِ شب) کی ادائیگی

کے ساتھ چوتھی گرہ بھی کھل جاتی ہے، یوں باطن ہی نہیں زندگی کے دیگر امور کی بندشیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّه صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَعْقِدُ الشَّيْطَانُ عَلَى قَافِيَةِ رَأْسِ أَحَدِكُمْ إِذَا هُوَ نَامَ ثَلَاثَ عُقَدٍ يَضْرِبُ كُلَّ عُقْدَةٍ عَلَيْكَ لَيْلٌ طَوِيلٌ فَارْقُدْ فَإِنْ اسْتَيْقَظَ فَذَكَرَ اللَّهَ انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَإِنْ تَوَضَّأَ انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَإِنْ صَلَّى انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَأَصْبَحَ نَشِيطًا طَيِّبَ النَّفْسِ وَإِلَّا أَصْبَحَ خَبِيثَ النَّفْسِ كَسْلَانَ ۔(بخاری، رقم:۱۱۴۲)

ترجمہ: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان آدمی کے سر کے پیچھے رات میں سوتے وقت تین گرہیں لگا دیتا ہے اور ہر گرہ پر یہ افسوں پھونک دیتا ہے کہ سو جا ابھی رات بہت باقی ہے پھر اگر کوئی بیدار ہو کر اللہ کی یاد کرنے لگا تو ایک گرہ کھُل جاتی ہے پھر جب وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر اگر نماز (فرض یا نفل) پڑھے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے۔ اس طرح صبح کے وقت آدمی چاق و چوبند خوش مزاج رہتا ہے۔ ورنہ سست اور بد باطن رہتا ہے۔

حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ کے تجربات کی تائید حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعے سے بھی ملتی ہے، قرآن مجید کے مطابق جب انہوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے چشمہ پھوٹا، اور اس پانی سے غسل کرنے پر ان کی بیماریاں دور ہو گئیں۔ (القرآن، ص ۴۲:۳۸)

حضرت علی ہجویریؒ نے اپنے روحانی سفر میں "ملامت" کے عمل کو بھی بطور ایک تربیتی وسیلہ اختیار کیا، جس کے ذریعے اُنہوں نے اپنے احوالِ باطن میں بلندی، کشادگی اور بسط حاصل کیا (ہجویری، ۲۰۱۲، ص ۱۷۱)۔ ملامت کا مطلب ہے کہ انسان اپنے نفس کی اصلاح اور اخلاص کی حفاظت کے لیے لوگوں کی تنقید اور ملامت کو خندہ پیشانی سے قبول کرے، حتیٰ کہ ظاہری بدنامی بھی اس کے روحانی مقام کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ حضرت ہجویریؒ کا یہ طرزِ عمل دراصل اُس حدیثِ مبارکہ پر مبنی تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین قسموں کے ساتھ وسعت رزق، رفعت درجات اور حصول عزت کا ضابطہ بیان فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان پر یقین ہی انسان کو ملامت کی پرواہ کیے بغیر، اخلاص سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہونے کی صلاحیت دیتی ہے۔(ترمذی، رقم:۲۳۲۵)

اسی طرح، ذکرِ الٰہی بھی باطنی احوال میں تبدیلی اور ارتقاء کا ایک بنیادی ذریعہ ہے۔ جب انسان غفلت کی حالت سے نکل کر ذکر میں مشغول ہوتا ہے، تو وہ بے خبری سے آگاہی، اور دوری سے قرب کی جانب سفر کرتا ہے۔ یہ روحانی قانون قرآنِ مجید کی سورۃ المزمل میں نہایت خوبصورتی سے بیان ہوا ہے، جہاں رات کے وقت عبادت کو روحانی نشوونما کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ رات کی خلوت میں کی جانے والی یادِ الٰہی انسان کو باطنی طور پر مضبوط کرتی ہے، اور زندگی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو پامال کر کے اُس کے دل کو اللہ کی طرف مائل کرتی ہے۔ جب ذکر، شعور، استقامت اور نیت کی تبدیلی کے ساتھ کیا جائے، تو یہ محض لَفظی عبادت نہیں رہتا بلکہ ایسا عمل بن جاتا ہے جس کے ذریعے انسان اللہ کی طرف سے خصوصی حمایت اور سرپرستی حاصل کرتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ خود اُس کا "وکیل" بن جاتا ہے—یعنی مددگار، محافظ، اور راہنما۔

ذکر اگر محض رسمی عمل کے طور پر کیا جائے تو اس سے یہ تاثیرات مرتب نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے خیال اور قلب و باطن کو ذکر سے اس طرح منور کرنا کہ 'مذکور' کے خُلق سے بندہ متخلق ہو جائے، تاثیرات کو یقینی بناتا ہے۔ بندے کے مسائل کا حل یہ ہے کہ اسے اپنی حقیقت کا ادراک ہو۔ جب تک بندے کو اپنی حقیقت کا ادراک نہیں ہو گا وہ نہ اپنے منصب کا تعین کر سکے گا اور نہ اپنے مسائل کی ماہیت سے آگاہ ہو سکے گا۔ بندے اور حق کے درمیان صرف خیال کا پردہ ہے۔ خیال ہی میں بندہ حق سے غیر حق کی طرف منتقل ہوتا ہے اور خیال ہی میں بندہ واصل باللہ ہوتا ہے۔ حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں:

فاعلم ان التصوف تشبیه بخالقنا
لانه خلق فانظر تری عجبا
کیف التخلق والمکر الخفي له

في خلقه وبهذا القدر قد حجبا
وذمه في صفات الخلق فأعتبروا
فيه فذا مثل للعقل قد ضربا
ان الحديد إذا ما الصنع يدخله
في غير منزلة يرده ذهبا
كذلك الخلق المذموم يرجع مح
موداً إذا هو الرحمن قد نسبا
ان التصوف أخلاق مطهرة
مع الأله فلا تعدل به نسبا

(ابن عربی ۱۹۹۸، جلد دوم، ص ۲۶۳)

ترجمہ:

پس جان لو کہ تصوف دراصل ہمارے خالق (کے خُلق) کی مشابہت اختیار کرنے کا نام ہے،
کیونکہ وہ (خالق) خود خُلق ہے، دیکھو! تو حیرت انگیز مناظر پاؤ گے۔
صفاتِ الٰہی کو اپنانا اور اس کی خفیہ تدابیر کو سمجھنا کیونکر ممکن ہے،
کہ وہ تدابیر اس کے خُلق میں پوشیدہ ہیں، اور یہی حقیقت ایک خاص پردے میں چھپی ہوئی ہے۔
اور اُس (خدا) نے مخلوق کی مذموم صفات کو ذمّت کی نگاہ سے دیکھا، پس اس میں غور کرو،
یہ عقل کے لیے ایک مثال ہے جو پیش کی گئی ہے۔
جیسے لوہا جب کسی ماہر صنعت کار کے ہاتھوں میں آتا ہے،
تو وہ اُسے غیر معمولی حالت میں ڈال کر سونے جیسا قیمتی بنا دیتا ہے۔
اسی طرح مذموم (ناپسندیدہ) صفات بھی جب رحمن کی طرف منسوب ہو جائیں،
تو وہ صفات محمود (قابلِ تعریف) بن جاتی ہیں۔
یقین رکھو کہ تصوف پاکیزہ اخلاق کا نام ہے،
جو اللہ کے ساتھ خاص تعلق رکھتا ہے — پس اس جیسی کوئی اور نسبت نہیں ہے۔

حضرت ظہور احمد قادری لکھتے ہیں کہ بندے کو اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے کہ جب حقیقت صرف اللہ ہے تو وہی ہر حرکت کا محرک ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر حرکت اللہ ہی کے محرک ہونے سے ہے تو کسی حرکت کو بلاوجہ، منفی، بے نتیجہ یا محض شر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہیں سے یہ معلوم ہوا کہ بندے کو ہمیشہ مثبت زاویہ نگاہ اختیار کرنا چاہیے۔ چاہے ظاہراً کوئی حرکت کتنی ہی ناپسندیدہ، ناقابل قبول اور شر کی حامل ہی کیوں نہ نظر آتی ہو قرآنی اصول 'لا تحسبوہ شرا لکم بل ھو خیرلکم' کے تحت اسے ہمیشہ خیر اور رحمت کا باعث سمجھنا چاہیئے۔ جب بندہ یہ انداز فکر اپنالے تو اس کا آخری نتیجہ ہمیشہ خیر ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر اللہ کا وجود کبھی بھی نہ تھا۔ لہذا بتان وہم و گماں سے نکل کر کیفیت توحید میں مستقیم ہو جانا ہی کمال کا نقطہ آغاز ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کا مستقل وجود نہیں۔ اس لیے روحانی ارتقاء کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اپنے وہم و گمان کے بنائے ہوئے تمام تصورات اور ظاہری سہاروں کو چھوڑ کر خالص توحید کی کیفیت میں قائم ہو جائے۔ جب تک انسان اس کیفیتِ توحید سے ہٹ کر عمل کرتا ہے، تو اس کا اثر صرف ایک محدود صفت کی حد تک ہوتا ہے، جو نہ مکمل ہوتا ہے، نہ مؤثر، اور نہ ہی دیرپا۔ لیکن جب انسان توحید کی حالت میں استقامت اور پختگی حاصل کر لیتا ہے، تب اس کا عمل صرف ایک صفت کی سطح پر نہیں رہتا بلکہ وہ اپنے وجود کی گہرائی سے صفات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ تصرف حقیقی ہوتا ہے—ہمہ گیر، دیرپا، مؤثر اور نتیجہ خیز۔

حضرت ظہور احمد قادری لکھتے ہیں کہ یہ کائنات حق کے اسماء اور صفات کا ظہور ہے۔ اس کائنات کی کوئی صورت اور حرکت حق کے اسماء وصفات اور تحرک کے مظہر ہونے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے ذہن میں جو خیال بھی آتا ہے اس کا محرک حق ہے۔ چونکہ مجردات چاہے وہ ارواح و نفوس ہوں یا عقول صورت کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتے لہذا یہ مجردات پہلے خیال پھر مثال اور پھر مادی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یوں زندگی کے معاملات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ بندے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ہستی خود ایک کتاب ہے جو معمول کے مطالعے میں رہنے والی کتابوں سے زیادہ جامع ہے۔ یہ کتاب کتاب وجود ہے

کتاب وجود چونکہ انسانی خیال سے الگ ہے اور یہ مظہر اسماء وصفات و تحرک حق ہے لہذا اس میں کوئی شک یا ریب نہیں ہو سکتا۔ کتاب وجود کا مطالعہ اور عرفان ہی انسان کو حقیقت اور ماہیت اشیا تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ زندگی کے مسائل کے حل کی کلید بھی ہے۔(قادری، ص ۱۴۳۔۱۴۴)

آپ فرماتے ہیں کہ وحدت اور کثرت کے تعلق کو سمجھنا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان کی تمام صفات ظاہر میں ایک دوسرے کی غیر ہیں لیکن ان کے باطن میں ایک ایسی طاقت کار فرما ہے جس کی وجہ سے یہ ساری صفات وحدت کی حامل ہیں۔ اسی طاقت سے انسان سنتا ہے، دیکھتا ہے، چلتا پھرتا ہے، بولتا سنتا ہے، اور کھاتا پیتا ہے۔ ان تمام صفات سے نظر اٹھا کر اس ایک طاقت پر نظر رکھنی چاہیے جو ان تمام صفات کی موصوف ہے اور اسی طاقت کے تحرک کی وجہ سے یہ صفات حرکت میں ہیں اور فعال ہیں۔ وہی طاقت اللہ ہے۔ اللہ کے وجود سے ہی ان صفات کی موجودگی ہے ورنہ بذات خود یہ صفات کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ کائنات اپنی تفصیلات میں ایک دوسرے سے مختلف اور الگ الگ نظر آتی ہے لیکن وہی طاقت کائنات کے ذرے ذرے میں صورت پذیر اور حرکت پذیر ہے۔ یہ اس کائنات کو وحدت کی اساس فراہم کرتی ہے۔ کل افراد کائنات کا مجموعہ ایک وحدت کا حامل ہے جیسے پانی کے قطرے الگ ہیں لیکن ان کی مجموعی کیفیت کا نام سمندر ہے۔ پانی کے قطرے ہوں یا سمندر دونوں کا انداز، ترکیب اور حقیقت ایک ہی ہے۔ یعنی جو کچھ قطرے میں ہے سمندر کی بھی وہی حقیقت ہے یا دوسرے الفاظ میں قطرہ عین سمندر ہے۔(قادری، ص ۲۴)

اس ارتقا کے سفر میں خیال کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ انسان کی تمام اچھی اور بری کیفیات اس کے خیال میں ہیں مثلاً خوف۔ یہ خیال ہی ہے جسے ہم خوف کہتے ہیں۔ اگر اس خیال کو نکال دیا جائے تو خوف کا وجود ختم ہو جائے گا۔ خوف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان جزوی طور پر سوچتا ہے کہ یہ میں ہوں، میرا بیٹا ہے، میری بیوی ہے، میرا بھائی ہے، میری جائیداد ہے وغیرہ۔ جہاں سوچ کا یہ انداز ہوتا ہے وہاں انسان کلیت سے محروم ہو جاتا ہے اور دوئی کا شکار ہو جاتا ہے جو کہ حقیقت نہیں۔ کیونکہ نہ تو انسان خود حق ہے نہ اس کی ملکیت ہی

حق ہے۔ بلکہ ہر شے ایک ہی طاقت کی مظہر ہے اور ہر شے میں اسی کا ہونا ہے۔ حرکت اور صفت اسی کی ہے۔ وہی محرک ہے ہر فرد میں اور کوئی کائنات میں۔ جب انسان مرتبہ کلیت پر فائز ہوتے ہوئے اسی طاقت پر توجہ مرکوز رکھتا ہے تو ہر طرح کا خوف ختم ہو جاتا ہے۔(قادری، ص۲۵،۲۴)

آپ فرماتے ہیں کہ آج کے انسان کے اخلاقی، جذباتی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا تقاضہ ہے کی ذات حق کے تصور کو اس طرح متعارف کروایا جائے کہ وہ آج کے انسان کو مسائل سے نکلنے کا راستہ دے۔ سابقہ ادوار میں انسانی ادراک کو سمجھانے کے لیے اور خوف اور ترغیب کے لیے جو اصطلاحات وضع کی گئی تھیں آج کے زمانے میں ذہنی سطح اور ادراک کا درجہ ان اصطلاحات سے بہت بلند ہو چکا ہے۔ آج علوم کی ترقی کی وجہ سے معیار بدل گیا ہے۔ آج آواز بھی مجسم ہے اور صورت بھی۔ سائنسی ایجادات کے نتیجے میں آج کے انسان کی ذہنی سطح پہلے سے بہت بلند ہے۔ آج کے انسان کو سمجھانے کے لیے موجودہ دور کی ذہنی بلندی اور ادراک کے معیار کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔(قادری، ص۲۵)

ہمارے مسائل کا ایک بڑا سبب زندگی میں افراط اور تفریط ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے "میں" کے التباس سے نکلنا ضروری ہے۔ جب کوئی شخص میں کہتا ہے تو اس سے مراد غیر حق نہیں بلکہ وہ حق ہے جو میں کا محرک ہے۔ اگر ترازو کو دیکھیں تو اس کے دو پلڑے ہوتے ہیں اور درمیان میں زیرو پوائنٹ۔ زیرو پوائنٹ پر کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ پلڑوں کے جھکاؤ کی وجہ سے افراط و تفریط پیدا ہوتی ہے۔ زیرو پوائنٹ جہاں خود کوئی حرکت نہیں وہی افراط و تفریط کا محرک ہوتا ہے۔ اگر نظر پلڑوں پر رہے تو افراط و تفریط کبھی ختم نہیں ہوتی لیکن اگر نظر زیرو پوائنٹ پر ہے جو مرکز ہے تو اعتدال قائم ہو جاتا ہے۔ یہی نکتہ ذات ہے۔ اگر انسان کو مجبور محض سمجھا جائے یا مختار یہ دونوں نقطہ ہائے نظر افراط اور تفریط کے حامل ہیں۔ انسان خود ہی صاحب اختیار بھی ہے اور مجبور محض بھی۔ جب انسان اپنی ذات پر امر لگا کر اپنے آپ کو پابند کرتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے لیکن جب خود ہی ایک نیا امر لگا کر اسے بدلتا ہے تو اس وقت وہ مختار ہوتا ہے۔

یعنی مجبوری اور مختاری دونوں انسان کی اپنی ذات کے عمل ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھ کر زندگی کے معاملات پر اس کا اطلاق کرنا درکار ہے۔(قادری، ص۲۶)۔

ارتقائے ذات کے اس سفر کو درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ بندے کی حقیقت

۲۔ حق تعالیٰ سے تعلق اور ہستی موھومہ کی نفی

۳۔ ہستی موھومہ سے رستگاری کے اقدامات

۴۔ نفی ہستی موھومہ کے احساس کی پختگی کے اسالیب

۵۔ ہستی موھوم کے ازالے میں رکاوٹ

۶۔ ہستی موھوم کے ازالے کے نتائج و ثمرات

اب ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔

۱۔ بندے کی حقیقت

'جمال و کمال' کی صوفیانہ اپروچ کے مطابق سب سے پہلے اس تصور کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ عبدیت سے یا بندگی سے کیا مراد ہے؟ ہر انسان اللہ کی عبادت اپنے خیال کے مطابق کرتا ہے لیکن اللہ انسانی خیالات سے ماوراہے۔ اگر انسان قرب حق کو اپنی ذات کا حصہ بنالے تو پھر اللہ بندے کا نگران بن جاتا ہے یعنی بندہ بندگی کے اس مقام پہ ہوتا ہے جہاں وہ ہر وقت اللہ کی نگاہوں میں ہے اور اس کے ارادوں میں اللہ کا ارادہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔(قادری، ص ا)

یعنی یہ عبدیت کی ایسی حالت ہے جہاں کسی وقت بھی بندہ اپنے باطن کی دنیا میں معبود سے غیبت میں نہیں ہوتا بلکہ یہاں معبود خارج میں کسی زمانی یا مکانی فاصلے پر نہیں بلکہ بندے کے باطن میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر بندہ اپنی خود کلامی اور من کی دنیا میں جاری خیالات کو اللہ کے حضور ہر وقت حاضر رکھے تو اس پر یہ نکتہ منکشف ہو گا کہ اس کے خیالات کی دنیا میں اس سے خطاب کرنے والا کوئی دوسرا نہیں بلکہ ذات حق ہے۔ یہ ایک جست ہے جو انسان کو عبد سے عبدہ کی طرف لے آتی ہے یعنی بندگی کا ایک ایسا حال جہاں ہر وقت اور ہر لمحے انسان کے خیالات

کی دنیا ذات حق سے رہنمائی لے کر اس کے ظاہری جسمانی وجود کو معمول کی سرگرمیوں میں اگے بڑھا رہی ہوتی ہے۔(قادری، ص ۲)

اپنے باطن میں ذات حق کی موجودگی کا یہ احساس انسان کو جزئیت سے کلیت کی طرف لے کے اتا ہے یعنی جزئیت میں تو انسان جہان کا ایک حصہ ہے جبکہ کلیت میں اس کی ذات کل جہان پر محیط ہوتی ہے۔(قادری، ص ۳) اس حال کی توثیق خارج میں قول کی موثریت سے ہو گی یعنی ذات حق کی موجودگی کہ احساس کے ساتھ کائنات پر محیط ہوتے ہوئے کسی موقف کو اختیار کرنا اور پھر اس موقف کا خارج میں درست ثابت ہونا اس حال کی توثیق کرے گا اور اس کا اغاز ابتدا اپنی ذات کے اخلاقی احوال سے ہو گا جیسے جیسے یہ حال پختہ ہو گا اخلاقی احوال میں استقامت اور استعداد میں وسعت پیدا ہوتی چلی جائے گی جو ذات حق کے باطن میں موجودگی کے بغیر ناممکن تھا۔(قادری، ص ۴)

۲۔ حق تعالیٰ سے تعلق اور ہستی موھومہ کی نفی

حق تعالی سے تعلق کو مستحکم کرنے کے لیے ظاہراً، باطناً ، قولاً اور فعلاً اپنے خیال کو حق تعالی کی طرف اس طرح متوجہ کرنا ہو گا کہ خیالات میں موجود کثرت موھومہ اور توہمات ہستی موھومہ کا خاتمہ ہو جائے ۔کیونکہ رسمی عبادات ،وہمی تعینات اور ہستی موھومہ کے تخیلات ہماری فکر اور ذہن پر اس طرح چھائے ہوتے ہیں کہ ہم اپنے باطن میں ذات حق سے تعلق پر ارتکاز پیدا نہیں کر سکتے جب ہماری فکر وحدت اختیار کرتے ہوئے اپنے مرکز میں اس طرح سمٹ آئے کہ اللہ کی ذات پر مرکوز ہو جائے اس وقت یہ عرفان حاصل ہوتا ہے کہ موثر حقیقی اور فاعل حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے اس تصور کو شعور سے لاشعور پھر لاشعور سے ورائے لا شعور اور پھر برتر از ورائے لاشعور مستحکم کرنا ہو گا۔ جب اس پر استقامت نصیب ہو جائے تو پھر قران مجید کی آیت 'فاینما تولوا فثم وجه الله 'کے مطابق جدھر بھی دیکھیں گے اللہ کا رخ نظر ائے گا اور یہی عبادت کی کامل صورت ہے۔(قادری، ص ۶، ۸) ابن عربی کے نزدیک تصوف دراصل اخلاق اور حکمت کا نام ہے، اور جو شخص اخلاق میں بہتر ہو، وہی حقیقتاً بڑا صوفی

ہے۔ صوفی کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن کو اپنا آئینہ بنائے، نفس پر قابو رکھے، اور اللہ کے بیان کردہ اوصاف کو انہی حالات میں اختیار کرے جیسے قرآن میں بیان ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

قال أهل طريق الله التصوف خلق فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في التصوف وسئلت عائشة أم المؤمنين عن خلق رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت كان خلقه القران وان الله أثنى عليه بما أعطاه من ذلك فقال " وانك لعلى خلق عظيم " ومن شرط المنعوت بالتصوف ان يكون حكيماً ذا حكمة وان لم يكن فلاحظ له في هذا اللقلب فانه حكمه كله فانه أخلاق وهي تحتاج إلى معرفة تامة وعقل راجح وحضور وتمكن قوي من نفسه حتى لا تحكم عليه الأغراض النفسية وليجعل القران أمامه صاحب هذا المقام فينظر إلى ما وصف الحق به نفسه وفي أي حالة وصف نفسه بذلك الذي وصف نفسه ومع من صرف ذلك الوصف الذي وصف به نفسه فليقم الصوفي بهذا الوصف بتلك الحال مع ذلك الصنف فأمر التصوف أمر سهل لمن أخذه بهذا الطريق ولا يستنبط لنفسه أحكاماً ويخرج عن ميزان الحق في ذلك فانه من فعل ذلك لحق بالأخسرين أعمالاً الذين ضل سعيهم في الحياة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا(ابن عربی،۱۹۹۸، جلد دوم، ص ۲۶۳)

ترجمہ: اہلِ طریقت (یعنی اللہ کے راستے پر چلنے والوں) نے فرمایا کہ: تصوف دراصل اخلاق کا نام ہے، چنانچہ جو شخص تم سے اخلاق میں بڑھا ہوا ہو، وہ تم سے تصوف میں بھی بڑھا ہوا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، امّ المؤمنین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا: "آپ کا اخلاق قرآن تھا۔" اور اللہ تعالیٰ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی صفت پر تعریف فرمائی: "اور بے شک آپ عظیم اخلاق کے مرتبے پر فائز ہیں۔" (سورۃ القلم،: ۴)

تصوف سے موسوم شخص (یعنی صوفی) کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ حکیم اور صاحبِ حکمت ہو۔ اگر وہ حکمت نہیں رکھتا تو اس لقب (صوفی) میں اُس کا کوئی حصہ نہیں، کیونکہ تصوف سراسر حکمت ہے، اور یہ اخلاق پر مبنی ہے۔ اور اخلاق کو سمجھنے کے لیے درج ذیل چیزیں ضروری ہیں:

- مکمل معرفت
- پختہ عقل
- دل کی حاضری
- نفس پر مضبوط قابو

تاکہ نفسانی خواہشات اس پر غالب نہ آ جائیں۔ صوفی کو چاہیے کہ قرآن مجید کو اپنا آئینہ بنائے، اور اس میں غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کن اوصاف کے ساتھ خود کو بیان کیا ہے، کون سی حالت میں وہ صفات بیان کی ہیں، اور کس قوم یا صنف کے ساتھ وہ صفات منسلک کی ہیں۔ صوفی کو چاہیے کہ انہی اوصاف کو انہی حالات میں انہی افراد کے ساتھ اختیار کرے۔ پس تصوف کا راستہ بہت آسان ہے اُس شخص کے لیے جو اسے اس طریقے سے اختیار کرے، اور جو شخص اپنی طرف سے احکام گھڑتا ہے اور حق کے میزان سے باہر نکلتا ہے، تو وہ ان لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا:

" جن کے اعمال دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئے، اور وہ گمان کرتے رہے کہ وہ اچھا کر رہے ہیں۔ " (سورۃ الکہف، آیت ۱۰۴)

حضرت ظہور احمد قادری فرماتے ہیں کہ ہستی موھومہ کے توہمات سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ظاہر میں کار فرما تمام صفات پر توجہ کرنے کے بجائے اس طاقت پر نظر رکھے جس کی وجہ سے یہ صفات فعال ہوتی ہیں ۔مثلاً آدمی سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے، چلتا بھی ہے، پکڑتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، کھاتا پیتا بھی ہے لیکن ہماری نظر آدمی کے ان معاملات پر نہیں بلکہ ان سارے کاموں کے پیچھے موجود شخصیت پر ہوتی ہے۔ اسی طرح کائنات میں کار فرما تمام صفات کے پیچھے ایک ہی طاقت ہے اور وہ اللہ ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں اسی طاقت کی کار فرمائی ہے۔ جس طرح پانی کے قطروں کی مجموعی کیفیت کا نام سمندر ہے قطرے قطرے میں ایک ہی انداز ہے ایک ہی ہیئت ایک ہی ترکیب اور ایک ہی حقیقت ہے۔ سمندر کی بھی وہی حقیقت ہے جو حقیقت قطرے کی ہے۔ اگر ہماری نظر قطروں سے اٹھ کے سمندر پہ چلی جائے تو ہماری اپروچ

بدل جائے۔ ہماری زندگی میں خوف کا عنصر بھی اسی لیے موجود ہوتا ہے کہ ہم جزوی طور پر کسی خیال کو اپنے اوپر حاوی کر لیتے ہیں اس طرح خوف ہمارے خیال میں ہم پر غالب آجاتا ہے۔ اگر ہم جزوی طور پر اپنے اوپر حاوی ہونے والے اس خیال کو دور کر دیں تو خوف خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اگر ہمیں اس چیز کا تجربہ ہو جائے کہ ہر شے ایک ہی طاقت کی مظہر ہے، ہر شے میں اسی کا ہونا ہے، ہر حرکت اور صفت اسی کی ہے وہی محرک ہے، ہر فرد اور ہر قائم اور پوری کائنات میں وہی محرک ہے حتی کہ جس معاملے میں ہمیں خوف لاحق ہے اس میں بھی وہی محرک ہے تو ہماری توجہ اس طاقت پر ہو گی اور خوف کا باعث بننے والا فرضی خیال یا مستقبل کا مفروضہ ہم پر غالب اکر ہمیں خوف زدہ کبھی بھی نہیں کر سکے گا۔ (قادری، ص ۲۴، ۲۵)

۳۔ ہستی موھومہ سے رستگاری کے اقدامات

ہستی موھومہ کو ترک کرنے کے لیے تین اقدامات ضروری ہیں: وضو، نماز اور شغل ۔

ا۔ وضو:

وضو پر مسلسل دھیان رکھنا درکار ہے وضو کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ذات حق ہے میں نہیں ہوں تمام افعال اللہ کی طاقت اور اللہ کے اذن سے سرزد ہو رہے ہیں۔ یعنی وضو کے ذریعے سے اپنی ہستی اور اختیار سے ہاتھ دھونا ہے۔ ہر حرکت کو اس انداز سے سوچنا اور اپنے ذہن میں اس خیال کو پختہ کرنا ہے کہ سب کچھ اللہ کی طاقت سے ہو رہا ہے اللہ کے اذن سے ہو رہا ہے اور کوئی ذرہ بھی اللہ کے اذن کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ اس طرح وضو کرنے سے برزخ کبری کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ برزخ کبری کا مطلب یہ ہے کہ انسان بیک وقت عالم مادیت میں رہتے ہوئے ذات حق کی موجودگی کو محسوس (experience) کرتا ہے۔ اس طرح انسانی عقل دنیاوی نفع و نقصان کے تناظر میں سوچنے کے بجائے اللہ کی ہر ہر حوالے سے موجودگی اور اس کی طاقت اور اذن کے جاری ہونے کی عینک سے دیکھ کر سوچتی ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر معمولات میں رہتے ہوئے کوئی منفی خیال آئے تو اس سے بھی وضو کے دھیان کے ذریعے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یعنی اس خیال کو برائی کے

خلاف، اعداء کے خلاف یا کسی اور رخ کی طرف موڑ کر اسے وہاں فنکشنل کر دیں۔ یعنی کسی بھی صورت میں چاہے حالات کچھ بھی ہوں، اپنے مرکز سے ہٹ نہ ہٹیں اور مرکز وضو کا خیال ہے۔

۲۔ نماز:

نماز مرتبہ محبوبی ہے یعنی یہ تصور کہ میں نہیں حضور ہی ہیں سر تا پا حضور ہی کر رہے ہیں جب اس کیفیت پر استقامت مل جائے تو یہ مرتبہ مرتبہ محبوبی ہے اس مرتبے کی حفاظت اللہ کے ذمے ہو جاتی ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اور اول آخر کے لیے وضو پر دھیان رکھنا ہی کافی ہے یعنی یہ کہ میں نہیں صرف ذات حق ہے وہی ہے اسی کے ارادے سے کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ وہ ہر صورت میں جلوہ گر ہے ہر صورت کا عین ہے جس انداز سے وہ جلوہ گر ہے یا ہو رہا ہے وہ اسی کے ارادے پر منحصر ہے۔ ہر واقعہ علم الٰہی میں ہے ہر آن اور ساعت اس کے ارادے کا ظہور ہے۔ وہ عین زمان ہے اور خیر محض ہے۔ لہذا ہر واقعہ ہر حرکت عین خیر ہے وہ عقل جو اسے اچھا یا برا کہتی ہے اس سے گزر جانے کی ضرورت ہے۔ (قادری، ص۳۷،۳۹)

۳۔ شغل:

اس سے مراد یکسوئی کے ساتھ ذکر الٰہی اور اللہ کی طرف دھیان ہے۔ آپ فرماتے ہیں قبولیت دعا کے لیے توجہ کی یکسوئی ضروری ہے۔ وضو پر دھیان توجہ میں کمال یکسوئی پیدا کرتا ہے یعنی ذہن کو ہر خیال سے اس طرح خالی کرنا چاہیے کہ توجہ کی ایسی یکسوئی حاصل ہو جائے جس میں کوئی چیز دخل اندازی نہ کرے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر ایک امر پر توجہ مرکوز کر کے مشق کرنی چاہیے کہ توجہ صرف اسی خیال پر مرکوز رہے اور کوئی دوسرا خیال دخل اندازی نہ کر سکے جس خیال پر توجہ مرکوز ہو گی خارج میں اس کے ظہور کے اسباب خود بخود میسر آتے جائیں گے کیونکہ توجہ کی یکسوئی کے ساتھ دعا میں جذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس طرح زمین ڈھلوان ہو تو پانی خود بخود ادھر بہنے لگتا ہے یہی صورتحال اس جذب کی ہے کہ اس طرح دعا قبولیت کو اپنی طرف خود بخود کھینچتی ہے لیکن درجہ کمال یہ ہے کہ کوئی خیال بھی نہ ہو اور ذہن بالکل خالی ہو اگر انسان مکمل طور پر بے طلب ہو جائے تو اس محویت فی ذکر الٰہی کا اجر یہ ہوتا ہے کہ ذات کبریا اس

انسان کے مستقبل کے متعلق جملہ خدشات اور خیالات کو پورا کرنے کا ذمہ لے لیتی ہے اور انسان ماضی حال اور مستقبل کے خدشات سے آزاد ہو جاتا ہے۔ (قادری، ص ۴۰، ۴۱)

ہستی موھومہ سے رستگاری میں یقین کی اہمیت

ہستی موھومہ سے نجات کا راستہ یقین پر کاربند ہونا ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم یقین کریں یا نہ کریں حق تو ہر صورت میں موجود ہے۔ ہمارے یقین نہ کرنے سے حق کی حیثیت تبدیل نہیں ہوتی یقین کرنے سے ہماری حیثیت تبدیل ہو جاتی ہے یعنی یہ سمجھ لینا کہ حقیقت کے اعتبار سے میں ہی ہر شے کا محرک ہوں سب کچھ میرے ارادے اور خواہش سے ہو رہا ہے کیونکہ حق ہی میری صورت میں موجود ہے وہ خود اس صورت میں مرکز کائنات ہے وہی محرک ہے۔ میں اور وہ الگ الگ نہیں میری صورت میں وہی موجود ہے۔ اس اعتبار سے میں ہی مرکز کائنات ہوں میں ہی محرک اعلی ہوں حقیقت کے اعتبار سے سب کچھ میں ہی ہوں کیونکہ وہ ذات کائنات کے ذرے ذرے میں خود ہی عیاں ہے اور میری صورت میں بھی وہی موجود ہے اس سے میری حیثیت بالکل بدل جاتی ہے اس کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی منفی خیال آئے تو یہ ارادہ کریں کہ میں ایسا نہیں چاہتا بلکہ محرک اعلی ہونے کی حیثیت سے یوں چاہتا ہوں اور اس طرح اس خیال کو مثبت میں بدل دیں تو وہ خارج میں بھی تبدیل ہو جائے گا۔ حالات سوچ کا آئینہ ہوتے ہیں سوچ کو مثبت رکھنے سے اور اسے مثبت رخ دینے سے اپنے اس اختیار کو استعمال کریں کہ میں یوں نہیں چاہتا بلکہ یوں چاہتا ہوں خیال ایک امکان اور لہر ہوتا ہے اور وہ لہر امر کی طالب ہوتی ہے جب ہم مرتبہ کل میں ہوتے ہوئے امر جاری کرتے ہیں تو خیال اسی صورت میں صورت پذیر ہو گا دراصل یہ ہمارے محسوسات ہیں جنہیں ہم اپنے حواس کے ذریعے خود ہی اپنے اوپر مسلط کر لیتے ہیں اور خود ہی انہیں ذہن سے نکال بھی سکتے ہیں جب محرک اعلی تو ہے تو تو ہی خیال کے ذریعے عالم امکان میں تغیر پیدا کر رہا ہے لیکن ہماری ہستی اور حیثیت میں یہ تبدیلی اور ارتقا اپنی ہستی میں ذات حق کے اثبات پر یقین محکم سے ہوتا ہے۔ (قادری، ص ۴۲، ۴۳)

'جمال و کمال' کے مطابق ہستی موھومہ سے رستگاری کے حال کا یومیہ معمولات میں اطلاق تین طرح سے کیا جاتا ہے:

الف۔ خود کو بندہ سمجھ کر دوسرے بندے سے گفتگو کرنا،

ب۔ خود کو حق اور دوسرے کو بندہ سمجھ کر گفتگو کرنا،

ج۔ خود اور مخاطب دونوں کو حق سمجھ کر گفتگو کرنا۔

تیسرا انداز ارتقاء کی اعلی منزل ہے کہ انسان کو اپنے حق ہونے اور دوران گفتگو مخاطب کے بھی حق ہونے کا ایکسپیرینس ہو۔ یقین محکم سے اس امر کا اثبات کرو کہ غیر حق نہیں ہے کیونکہ اگر ہم یقین نہ بھی کریں ،وہ تو موجود ہے اور ہمارے یقین کرنے نہ کرنے سے اس کے موجود ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔لہذا کسی بھی مرحلے پر اس کے اور اپنے حق ہونے کے حال سے غفلت کا شکار ہو کر اپنی سوچ اور ذہنی رویے کو منفی نہ ہونے دیں ۔اپنا ذہنی رویہ اور سوچ ہمیشہ مثبت رکھیں جو بھی خیال آئے اسے حق کی طرف سے سمجھیں اور سمجھیں کہ بالکل یہی بہتر ہے۔ اس وقت جو بھی خیال ہے عین یہی مشیت حق ہے۔ اس سے بہتر اور اچھا آپشن ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر منفی خیال ہے تو اس میں بھی بہتری پوشیدہ ہے اور عظیم مصلحت ہے یہ الگ بات کہ ہماری عقل ابھی اسے کماحقہ نہ سمجھ سکے۔ یعنی حق کے اثبات کے ذریعے منفی خیال سے بھی مثبت اثر لینا چاہیے اور اگر منفی خیال آئے تو فورا امر جاری کریں کہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ جہاں یکسوئی میں خلل آئے تو اس کیفیت کو دوبارہ پیدا کریں ہو اس پر اس طرح استقامت حاصل کریں کہ انا قادر الوقت کا حال میسر آئے۔(قادری، ص۴۵،۴۶)

حق تعالی کے ساتھ تعلق میں ہستی موہوم کا اثبات اور نفی دونوں کا اپنا اپنا مقام و مرتبہ درجات اور پھر نتائج و اثرات ہیں۔ یعنی اسی پیکر کے اندر مقام عبدیت اور مقام الوہیت کا اظہار الگ الگ تقاضوں اور مرتبوں کے ساتھ ہو رہا ہوتا ہے۔ مقام الوہیت کے اظہار اور غلبے کے وقت نفاذ عمل کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ مقام عبدیت میں اظہار کے وقت حقوق العباد اور بقیہ حیاتیاتی تقاضوں کی تکمیل کا وقت یا مرحلہ ہوتا ہے۔ صاحب حکمت وہ ہے کہ جب اسے انا قادر الوقت کا

مرتبہ حاصل ہو تو اس سے پہلے اس کا کوئی ایسا واضح لائحہ عمل اور پروگرام ہو کہ جس کے لیے وہ صاحب امر ہوتے ہوئے کوئی امر جاری کر سکے۔ تاکہ اس کا وہ لائحہ عمل روبہ عمل اور تعبیر کی صورت میں حقیقت میں بدلنا شروع ہو جائے۔ عام آدمی کا المیہ یہ ہے کہ اولاً تو اسے ایک ہی ہستی کے اندر مقام عبدیت اور مقام الوہیت حد فاصل کے ساتھ پہچان کر لینا مشکل ہوتا ہے۔

اور اگر وہ مجاہدات اور مرشد کامل کی توجہ سے ان کا ادراک اور عرفان حاصل بھی کر لے تو جس وقت احساس کُل کا غلبہ ہو تو اس وقت وہ کوئی واضح امر جاری کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ مزید برآں جس احتیاط کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مرتبہ کل میں بھی حواس کی دخل اندازی جاری رہتی ہے۔ حواس کی اس دخل اندازی کو ختم کرنے کے لیے بشری تقاضوں کا محو کیا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ایک مرتبے یعنی مرتبہ عبدیت کی حد عبور نہیں ہو گی دوسرا مرتبہ شروع نہیں ہو گا۔ دھیان پر استقامت کے نتیجے میں بشری سوچ اور تقاضے محو ہوتے ہیں جس سے اجرائے امر کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ یعنی شعوری طور پر پہلے سے ایک لائحہ عمل کا موجود ہونا ضروری ہے اور یہ لائحہ عمل جب مسلسل شعور سے لاشعور سے بھیجا جاتا رہے گا تو وقت آنے پر وہ پروگرام یا لائحہ عمل لاشعور کی توانائی کے تحت روبہ عمل ہو جائے گا۔ یہ نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نتائج و اثرات کُل سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ اگر کُل کا ایک جزو بھی اس میں شامل نہ ہو تو کُل کُل نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ کہ کُل کے اثرات و ثمرات بھی سامنے نہیں آتے۔ جب بھی بشری تقاضوں کو کلیتاً محو کر کے دوسرے الفاظ میں ہستی موہوم کی نفی کر کے مرتبہ حق یا مرتبہ کُل پر فائز ہوتے ہوئے کوئی بات سوچی جائے گی تو ضرور پوری ہو گی۔ یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ مرتبہ کُل پر ہوتے ہوئے ہستی موہوم کی نفی کے ساتھ جس معاملے کے بارے میں امر جاری کیا جائے گا۔ وہ ضرور حقیقت میں بدلے گا۔ (قادری، ص۴۸،۴۹)

۴۔ نفی ہستی موھومہ کے احساس کی پختگی کے اسالیب

نفی ہستی موہومہ کے اسالیب شغل و دھیان ، وضو اور نماز پر مشتمل ہیں۔ ہستی موہومہ کی نفی پر پختگی کے لیے استقامت اور یقین بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ استقامت اور

یقین سے ہی مرتبہ جامع نظر آتا ہے۔ مرتبہ جامع سے مراد یہ ہے کہ مظہر عبدیت اور مظہر کُل بیک وقت فعال ہو اور حسب تقاضا اپنی حدود میں رہتے ہوئے روبہ عمل اور فعال ہو۔ (قادری، ص۵) علامہ اقبال نے اپنے خطبات *Reconstruction* میں لکھا ہے کہ ہر خیر و شر عبد کامل کی ذات کا حصہ ہے:

Good and evil, therefore, though opposites, must fall within the same whole. There is no such thing as an isolated fact; for facts are systematic wholes the elements of which must be understood by mutual reference. Logical judgement separates the elements of a fact only to reveal their interdependence. (Iqbal, 1993, p.68)

ترجمہ: پس، خیر اور شر اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن دونوں ایک ہی مکمل نظام کا حصہ ہوتے ہیں۔ کوئی حقیقت تنہا یا الگ تھلگ وجود نہیں رکھتی، کیونکہ حقائق دراصل ایک منظم مجموعہ ہوتے ہیں جن کے اجزاء کو باہم ربط کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ منطقی تجزیہ کسی حقیقت کے اجزاء کو صرف اس لیے جدا کرتا ہے تاکہ ان کے باہمی انحصار کو ظاہر کیا جاسکے۔

ا۔ مرکز کائنات ہونے کا یقین

انسان کو کائنات کو مرکز بنایا گیا ہے چاہے یقین کیا جائے یا نہ کیا جائے یہ ایک حقیقت ہے۔ یعنی حقیقت کے اعتبار سے عبد ہی ہر شے کی صورت موجود ہے اور وہی مرکز کائنات ہے۔ ہاں اس حقیقت کو یقین کے ساتھ اختیار کر لینے سے ہستی موہوم کے دائرے سے تجاوز ممکن ہو جاتا۔ یہ احساس کہ زمین اور آسمان کے درمیان موجود کائنات کا مرکز میں خود ہوں، ایک جزو یا چھوٹا سا جزو نہیں ہوں اس سے کائنات اور ہستی کے بارے میں انسان کا تناظر بدل جاتا ہے۔ ہر حرکت اللہ کی قوت اور اذن سے ہو رہی ہے یعنی ارادہ، خیال، دیکھنا اور سننا غرض کہ کوئی بھی حرکت ایسی نہیں ہے جو ذات کی قوت اور اذن سے نہ ہو رہی ہو۔ ہر فعل اللہ کا فعل ہے۔ ھو الباطن و الظاہر۔ یعنی ظاہر عین باطن ہے۔ دوسرے الفاظ میں تناظر عبدیت میں یہ سارا عمل مرتبہ عبدیت اور مرتبہ کُل سے جاری ہو رہا ہے۔ اور اس تصور کی پختگی ہستی موہوم کی گرفتاری سے کلیتاً رستگاری کو ممکن بناتی ہے۔ (قادری، ص ۱۲، ۱۳)

۲۔ وجود مطلق سے تعلق پر استقامت

ہستی موہوم سے رست گاری کا مطلب وجود مطلق سے تعلق کا استحکام ہے۔ وجود مطلق میں ایک ربط نظم اور ترتیب ہے جیسے ہی یہ ربط نظم یا ترتیب اختلال کا شکار ہو جس کے نتیجے میں خرابی، بگاڑ، اضمحلال، بیماری اور اس افراط و تفریط سے ہر پریشانی، غم، ملال اور خوف اور غم پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ازالہ ربط کی بحالی سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ وجود واحد سے ربط کے نتیجے میں خیالات میں اثر پذیری پیدا ہوتی ہے۔ یعنی حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی!

جوں جوں یہ ربط مستحکم ہوتا جاتا ہے اور اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے خیالات میں آفاقیت اور کائناتی انداز پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اثر پذیری بھی سامنے آتی ہے۔ کیونکہ جو خیال بھی وجود نسبت سے ہو گا اس میں آفاقیت اور اثر پذیری ہو گی ۔ وجود مطلق کی نسبت سے پیدا ہونے والے ہر خیال اور جاری ہونے والے خیالات کو کائنات تسلیم کرتی ہے۔ ایسا خیال عالم مثال سے عالم عنصریت اور پھر عالم عنصریت سے عالم وجود میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یعنی دائرہ عبدیت میں آنے والا یہ خیال دائرہ کُل کے امر کے تحت آرہا ہوتا ہے۔ ایسا خیال وہ روح ہے جو عالم اجسام میں اپنے اظہار کے لیے اسباب خود بہ خود پیدا کرتا ہے۔ اسباب خود بہ خود کس طرح بہم مربوط ہو کر نتائج تک لے آتے ہیں، یہ معاملہ حواس اور عقل سے ماورا ہے۔ علامہ اقبال نے *Reconstruction* میں بھی لکھا ہے:

..... pure reason is incapable of bringing that fire of living conviction which personal revelation alone can bring. (Iqbal, 1993, p.142)

ترجمہ: ۔۔۔ محض عقل خالص اس زندہ یقین کی آگ پیدا کرنے سے قاصر ہے جو صرف ذاتی واردات کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

یہ سب یکسوئی سے ممکن ہے۔ یکسوئی اپنے ہونے کے احساس سے ماورا ہو جانا ہے۔ اس حال میں جو بھی خیال ہو گا وہ مرتبہ کُل یا ذات حق کا خیال ہو گا۔ چونکہ ذات حق یا مرتبہ کُل مقیّد

نہیں مطلق ہے لہذا اس کا نفاذ اور اطلاق بھی ہر طرح کی قید اور نسبت کی تعین سے ماورا ہے۔ یفعل ما یشاء و یفعل ما یرید۔

مرتبہ کل اور عبدیت میں ربط

اس ربط کی بحالی کا ایک اسلوب مرتبہ کُل اور مرتبہ عبدیت کے درمیان موجود ایک واسطے کا عرفان ہے۔ اور وہ واسطہ سانس ہے۔ یعنی نفس اور جسم میں ایک ربط موجود ہے۔ بایں طور کہ ایک لطیف ہے اور ایک کثیر۔ ایک ہوا ہے اور دوسرا مٹی۔ صرف لطافت اور کثافت کا فرق ہے لیکن اس فرق کے باوجود ان دونوں میں ایک مسلسل ربط موجود رہتا ہے جس کی وجہ سے انسانی ہستی ایک کُل کے طور پر فعال ہوتی ہے۔ خود سانس بیک وقت طبعیاتی بھی ہے اور مابعد الطبیعاتی بھی۔ اس حیثیت سے سانس محض ہوا نہیں بلکہ کائناتی توانائی کا ایک لا محدود سمندر اور لا محدود دائرہ ہے۔ توانائی ہی مادہ ہے۔ سائنس نے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ توانائی اور مادے میں لطافت اور کثافت کا فرق ہے۔ کائنات دراصل مجسم توانائی ہے۔ نور الٰہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کو شے نہیں بلکہ عمل کہا گیا ہے۔ (قادری، ص ۱۵، ۱۶)

آج زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ذہنی سطح و ادراک بہت بلند ہو گیا ہے۔ آج آواز مجسم ہے، صورت مجسم ہے۔ یعنی ہر احساس، آواز اور تخیل کو ایک صورت کے طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ سائنسی تحقیقات اور ایجادات کی وجہ سے ہے۔ سائنسی ایجادات نے ذہنی سطح کو بہت بلند تر کر دیا ہے۔ لہذا آج کے انسان کے سمجھانے کے لیے موجودہ دور کی ذہنی بلندی اور ادراک کے مطابق گفتگو کی جانے چاہیے۔ خوف سب خیال میں ہے۔ اور یہ خیال جو خوف پر مبنی ہوتا ہے کلیت کے ضائع ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیز میری ہے۔ یہ تیری ہے۔ سوچ کا یہ انداز دوری پر مشتمل ہے جو کلیت کے ختم ہونے سے پیدا ہوا۔ جاننا چاہیے کہ ہر شے ایک ہی طاقت کی مظہر ہے۔ ہر شے میں اسی کا ہونا ہے ہر ہر حرکت اور ہر صفت اسی کی ہے۔ وہی محرک ہے ہر فرد میں بھی اور پوری کائنات بھی۔ اسی طاقت میں جب توجہ مرکوز رکھ کر کلیت کو ثابت کو

کیا جائے گا بجائے بطور جزو کے خود کو ثابت کرنے کے تو ہر طرح کا خوف خود ختم ہو جائے گا۔ (قادری، ص ۲۵)

حق سے دوری اور شک کی نفی

جو خیال دوری کے تحت پیدا ہوا ہوتا ہے وہ خوف، غم اور اختلال کا باعث بنتا ہے۔ لہذا باطن میں جو خیال بھی ابھرے۔ اسے حق کے سپرد کر کے دبا دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اس خیال کو روبہ عمل ہونے دیا جائے۔ اگر وہ خیال اذیت ناک ہے تو اس سے کام لیا جائے جب بھی خیال کو ارتکاز کے ساتھ کوئی سمت دی جائے گی تو اس سمت کے مطابق وہ خیال مرکوز ہو کر اپنے اسباب خود فراہم کرنے لگے گا۔ جیسے جیسے سوچ کا دائرہ وسیع ہو گا خیال روبہ عمل کرنے کے لیے اتنا ہی آفاقی و کائناتی موثر امر جاری کرنے کے حالات پیدا ہوں گے۔ جیسے آپ پیدا ہونے والے خیال کو مثبت انداز سے تحریک دیں گے تو اس سے اس کے نتائج پیدا شروع ہو جائیں گے۔ یعنی مرتبہ امر مرتبہ کُل میں ہوتے ہوئے خیال کے بہاؤ کو روکنے کی بجائے اسے موثر اور روبہ عمل کرنے پر توجہ دی جائے۔ (قادری، ص ۲۷، ۲۸) ریب یعنی شک کے ختم ہونے سے یقین اور اعتماد پیدا ہوتا ہے اس کے بعد تمام مراحل اعتماد اور یقین کے ہیں۔ یقین اور اعتماد تمام مراحل کو طے کرتا ہے۔ (قادری، ص ۳۵، ۳۶)

اللہ نور السموات و الارض کے تحت زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے نور الٰہی ہے۔ مجسم توانائی ہے۔ اگر یہ مجسم توانائی ہے تو جسم کے تمام خاصے دراصل توانائی ہی کے خاصے ہیں جسم کے خاصے نہیں ہیں۔ بلکہ جسم خود توانائی کا خاصا ہوتے ہوئے اس کا احساساتی یا حسی اظہار ہے۔ اس لحاظ سے محسوسات میں آنے والی حقیقت دراصل حق ہے جیسا کہ ارشاد ہوا: **الحق محسوس و الحق معقول**۔ یعنی محسوس عین وہی ہے۔ جب کہ خلق جو کہ دراصل وہم ہے کے تعین کے لیے عقلی پیراڈائم استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کو انسانی جسم کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ انسانی جسم کروڑاں اکائیوں سے مل کر وجود پاتا ہے۔ ہر اکائی اپنی جگہ پر ایک کُل اور ایک کائنات ہے۔ ایک الگ دنیا جس پر تحقیقات کے سلسلے اور علوم کے

کئی شعبے قائم ہیں لیکن جب ہم ایک فرد انسانی کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس وقت اس کی یہ جزوی اکائیاں ہماری نگاہ سے اوجھل ہوتی ہیں اور ہم اس وقت اس کو ایک بطور کل کے مخاطب کر کے اس کا ادارک یا تشخص متعین کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی صورت حال وجود مطلق کی ہے وجو د مطلق ایک کُل ہے جب بندہ اپنی انفرادیت کو اس کُل میں ضم کر دے تو وجود مطلق کے ساتھ ربط قائم ہو جائے گا اور وجود مطلق کے اس ربط کے ساتھ وہ وجود مطلق میں موجود اور شامل رہے گا۔ بقول عطار آب جورابعد ازاں زدریا مجو! جسم کا ہر عضو الگ الگ ہوتے ہوئے اپنے اپنے افعال و خواص رکھتا ہے۔ مثلاً سر اور پیر ایک ہی جسم اجزا ہیں لیکن پیر ہزاروں سال چلنے کے باوجود بھی سر تک نہیں پہنچ سکتے یہ حفظ مراتب ہے بعینہ وجود مطلق کی کلیت کے سامنے حفظ مراتب کی نفی یاان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم بظاہر الگ ہونے کے باوجود اعضا کا باہمی ربط پختہ ہو جائے تو جسم کے اجزاء کے انفردی افعال کے باوجود حتمی فعل جسم کے فعل کلی طور پر سامنے آئے گا۔ یہی کیفیت ربط حق کے بعد اظہار افعال اور اثرات و نتائج کی ہو گی۔ (قادری، ص ۱۷، ۱۸)

ارتکاز اور لگن

ہر معاملے کی موثریت کی شاہ کلید شدید لگن ہے۔ اور ہر لگن سے شدید اور موثر لگن اللہ کی لگن ہے۔ ہر کام اللہ کی عبادت اور بندگی ہے اگر وہ کام اللہ کے لیے اور اللہ کی لگن میں ہو۔ دنیا کے تمام کام کرو لیکن اللہ کا دھیان رکھ کر۔ جب اللہ کے دھیان سے غافل ہو جائیں تو پھر عبادت اور نماز، روزہ سب ریاکاری بن جاتے ہیں۔ تو اگر اللہ کی دھیان میں سو بھی جائیں تو وہ عبادت ہو گی۔ ہر سانس میں اللہ کا دھیان اور شدید اور سچی لگن موجود ہونا ضروری ہے۔ (قادری، ص ۵۱)

جملہ مجاہدات اور عبادات کا مقصد یوں ہی ہے جیسے ایک سرکش گھوڑے کو سدھارنے کے لیے جوتی ہوئی زمین میں ڈال دیں۔ تو وہ تھک ہار کر درست ہو جائے گا اور اشارے سمجھنے لگے گا۔ لیکن اگر یہ سارا مفہوم ایک جملے میں ادا ہو سکے تو مجاہدات کی کثرت اور ان پر صرف

ہونے والے زمانوں کی طوالت سب مختصر ہو جائیں گے۔ وہ اختصار یہ ہے کہ انسان کی زندگی محض ایک سانس ہے اس سانس کام لینا چاہیے اور اسے اللہ کے دھیان میں لگانا چاہیے۔ اہل حق کے دیکھنے کا انداز یہ ہے کہ وہ ہر شے کو مظہر خداوندی سمجھتے ہیں۔ جب کسی چیز کو اضافت، نسبت، پس منظر اور پیش منظر سے الگ کر کے اس سے ماوارا کر کے محض حق کی نسبت سے اور اس کے مظہر کے طور پر دیکھتے ہیں تو اسے عبدیت نصیب ہو جاتی ہے۔ عام انسان اور اہل حق کے انداز فکر میں یہی فرق ہے۔ (قادری، ص ۵۲)

انسانی سانس ایک دائرہ ہے ایک مسلسل دائرہ۔ مولانا روم نے فرمایا تم جسم کی حفاظت کرتے ہو حالانکہ اصل تو احساسات و ادراک ہیں:

اے برادر تو ہمہ اندیشی
ما بقی استخوان و ریشہ

(رومی، ۱۴۰۳، دفتر دوم، بخش ۹)، (رومی، ۱۳۹۹، فصل پنجاہ و دوم)

حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں:

فالصوفي من قام في نفسه وفي خلقه وفي خلقه قيام الحق في كتابه وفي كتبه " فما أصابك من حسنة فمن الله وما أصابك من شيئة فمن نفسك " فقد رميت بك على الطريق وليس التصوف بشئ زائد عند القوم سوى ما ذكرته لك وبينته ولكن الله انزل الميزان والعلم بالمواطن وبالأحوال فلا تخرج شيأ عن مقتضى ما تطلبه الحكمة " وننزل من القران ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين " فالتخلق به والوقوف عند يزيل المرض النفسي لا بد من ذلك ولكن للمؤمنين ولا يزيد الظالمين إلا خسارا إلا انهم يعدلون به عن موطنه ويحرفون الكلم عن مواضعه فيعممون الخاص ويخصصون العام فسمون ظالمين قاسطين۔ (ابن عربی۔ ۱۹۹۸، جلد دوم، ص ۲۶۴)

ترجمہ: پس صوفی وہی ہے جس کے نفس، اخلاق اور مخلوق کے ساتھ معاملہ میں اللہ کے حق (عدل و حکمت) کا وہی قیام ہو جس طرح اللہ نے اپنی کتاب میں اسے قائم کیا ہے اور اپنی

دیگر آسمانی کتابوں میں فرمایا: "پس جو بھلائی تمہیں پہنچے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو برائی تمہیں پہنچے، وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔" (سورۃ النساء، آیت ۷۹) پس (اے طالبِ حق!) ہم نے تمہیں راہ پر ڈال دیا ہے۔ یاد رکھو :تصوف، اہلِ طریقت کے نزدیک کوئی زائد شے نہیں سوائے اس چیز کے جسے میں نے تمہیں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے "میزان" (عدل کا ترازو) اور ان مقامات و احوال کا علم نازل فرمایا ۔ لہٰذا کسی چیز کو اُس کے حکمت کے دائرے، جو اس کے حال کا تقاضہ ہو، سے نہ نکالو۔ اللہ نے فرمایا: "ہم قرآن میں وہ چیز نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔" (سورۃ الإسراء، آیت ۸۲) پس قرآن کے اخلاق کو اپنانا اور اس کے حدود پر ٹھہرنا انسان کے نفسانی امراض کو دور کرتا ہے— اور یہ عمل ایمان والوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن ظالموں کے لیے یہ (قرآن) صرف خسارے میں ہی اضافہ کرتا ہے، کیونکہ وہ قرآن کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دیتے ہیں، الفاظ کو ان کے درست سیاق سے بدل دیتے ہیں۔ یہ لوگ:

- کسی خاص حکم کو عام کر دیتے ہیں
- اور کسی عام حکم کو خاص بنا دیتے ہیں

پس ایسے لوگ ظالم اور قاسط (یعنی عدل سے ہٹے ہوئے) کہلاتے ہیں۔

وسعت ادراک اور نتائج

احساس تمیز ہے جسم اسی ادراک اور احساس کے ساتھ قائم ہے۔ اصل چیز ادراک اور محسوسات ہیں جب ادراک اور تمیز ختم ہو جائے تو جسم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ سانس جب جسم سے گزرتا ہے تو ادراک و محسوسات پیدا کرتا ہے۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد ادراک اس دائرے میں مل جاتا ہے یعنی کائناتی دائرے کا حصہ بن جاتا ہے۔ ادراک کی وسعت کے ساتھ نتائج بدلنے لگتے ہیں۔ جناب حضرت علی المرتضیٰ کو ایک نجومی نے غزوے پر جانے سے منع کیا۔ آپ نے سبب پوچھا تو نجومی نے کہا کہ ستاروں کی چال اور بروج کی کیفیت کے پیش نظر آپ کا اس جنگ کے لیے جانا درست نہیں ۔ آپ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور فرمایا دو ستارے اور بھی ہیں وہ تم نے نہیں

دیکھے انہیں دیکھو ،اس نے دیکھا تو کہا جایئے۔ آپ مسکرائے ،نجومی نے عرض کیا حضور یہ کیسے ہوا؟ آپ نے فرمایا تم ستاروں کے تابع ہو اور ستارے ہمارے تابع ہیں۔ (قادری، ص ۵۳، ۵۴، ۵۵)

استقامت اور لچک کا کردار

ہستی موہوم کی نفی پر استقامت کے لیے عمل پر استقامت، تسلسل اور ہر طرح کی لچک کی نفی ضروری ہے۔ بندگی یہ ہے کہ جو بھی اصول وضع ہو جائیں ان پر سختی سے پابندی کی جائے اور لچک پیدا نہ کی جائے ورنہ دو رنگی ہو گی اور دو رنگی کا نتیجہ ناکام ہی ہوتا ہے۔ یہی عام انسانوں کی روش ہے۔ جو اصولوں پر سختی سے کاربند ہے، وہی کامیاب ہے۔ اہل حق یا دیندار ہمہ وقت اللہ یا حق کے ساتھ مصروف ہیں تو اسی صورت تو وہ بندگی حق کا لحاظ رکھ کر اس کے تقاضے پورے کر رہے ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر غفلت یا کسی بھی طرح کی کوتاہی لچک کو دعوت دیتی ہے۔ جب قرب حق میں رہتے ہوئے ہر آواز کو اللہ کی آواز، ہر صورت کو اللہ کی صورت اور ہر حرکت کو اللہ کی حرکت سمجھے تو اس پر استقامت ہی بندگی کا حق ادا کرنا ہے۔ اگر یہ بلا توقف ہے تو بندگی ہے اگر توقف ہے تو توقف کا دورانیہ غفلت ہے۔ قرب حق پر استقامت کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس مرتبے میں جو خیال ،اشارہ، آواز محسوس کرے اسے حق کی طرف سے سمجھتے ہوئے فوراً قبول کرے۔ اسی صورت میں نتائج بر آمد ہوں گے ورنہ بصورت دیگر مقابل تو اپنی ہستی موہوم کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے اس پر قائم اور مسلسل استقامت کے ساتھ کھڑا ہے۔ وہ اپنی استقامت کے دائرے کے اندر اپنی صفت کے غلبے کے حال میں قرب حق کا حامل ہوتے ہوئے دوسرے کی قرب حق پر استقامت کے باعث اس سے مغلوب رہے گا۔ سلطان ہند التمش کا بیمار قاضی القضاۃ جب حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسی طریق کے تحت اس کی بیماری کا علاج کیا۔ یعنی مرتبہ کل یا مرتبہ حق میں کسی ایک امر کو تسلیم کرنا اور دوسرے کو نہ کرنا دراصل غلط ہے۔ جس امر کا انکار کیا اس کی کمی یا تعمیل دوسرے امر کی تعمیل پورا نہیں کرے گی۔ یعنی ایک امر کے انکار کا داغ دوسرے امر کی تعمیل سے نہیں دھل سکتا۔ ہر

امر کو تسلیم کرنا اور بلاتوقف تسلیم کرنا ہی حقیقی تعمیل ہے۔ جو نتائج بر آمد کرتی ہے۔ یعنی مرتبہ عبدیت میں رہنے والے کی بجائے مرتبہ کل میں رہنے والے کو تعمیل کے بعد میں زیادہ احتیاط درکار ہے۔ اصول یہ ہے کہ جو جتنی زیادہ تیز رفتاری سے سفر کر رہا ہے اسے امکانی حادثوں کو سامنا بھی اتنا ہی کرنا پڑتا ہے۔ پیدل کی نسبت سائیکل سوار، سائیکل سوار کی نسبت بس یا کار سوار اور اس کی نسبت ہوائی جہاز پر سوار کو حادثات کا زیادہ خطرہ رہتا ہے۔ اسوہ حسنہ سے یہی اصول یہی ملتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند بھی رکھ دیں تو میں اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یعنی بندگی اصولوں کی انتہائی سختی سے پابندی کا نام ہے۔ یہ اپنی مرضی کے انتخاب یا لچک کا نام نہیں۔ (قادری، ص ۳۰، ۳۲)

۵۔ ہستی موہوم کے ازالے میں رکاوٹ

ہستی موہوم کی نفی میں حائل ایک بڑی رکاوٹ ہر درجے اور ہر سطح پر حواس کی دخل اندازی ہے۔ مرتبہ کل اس وقت ہی متحقق ہو گا جب تمام بشری تقاضے کلیتاً محو ہو جائیں گے۔ کیونکہ بشری تقاضوں کے محو ہونے پر ہی جو امر جاری ہو گا وہ موثر اور نتیجہ خیز ہو گا۔ اس میں حاءل بڑی رکاوٹیں یہ ہیں:

۱۔ یہ خیال کہ جسم محدود ہے، ہماری انسانی ہستی محدود ہے اور مرتبہ حق لا محدود ہے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کا تدارک اسی طور پر ہو سکتا ہے کہ اگر ہم اپنی انفس کی گہرائیوں میں اتر کر اس محدود اور لا محدود ہونے کا تجزیہ کریں تو لا محدود کلیتاً محو ہو چکا ہو گا اور پیش نظر صرف محدود ہو گا۔ لہذا وہ خود کو صورت میں دیکھ رہا ہے۔ اس انفس کی گہرائیوں کے مشاہدے کو جب اعتدال اور توازن کے ساتھ ظاہر کی تنگ نائیوں اور تحدیدات کے اندر ثابت اور متحقق کیا جائے گا تو اس سے مرتبہ کل یا مرتبہ حق کے شان جامعیت کے ساتھ متحقق ہونے کا آغاز ہو گا۔

۲۔ حق یا کل ہو کر جو بھی تصور کیا جائے گا اس میں ارتکاز کی شدت کے مطابق نتائج کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ نتائج پیدا نہ ہوں۔ حکمت کے تقاضوں کے تحت تاخیر کا

امکان ضرور موجود ہے لیکن کلیتاً روبہ عمل ہی نہ ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ (قادری، ص۴۸-۵۰)

۶۔ ہستی موھوم کے ازالے کے نتائج و ثمرات

علامہ اقبال قطرے کے دریا میں محو ہونے کے نہیں بلکہ دریا کو قطرے کے دامن میں سمیٹنے کی حکمت کے علمبردار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جزو نہیں عین کل ہو۔ کل ہونے کا منہج اور ثمرات یہ ہیں:

ا۔ شان کل میں رہو اور کل کے ساتھ کل ہو کر رہو گے تو جزو کے حوالے سے آنے والی کیفیات آناً فاناً ختم ہو جائیں گی۔ جیسا کہ عبدالرحمن جامی نے کہا:

گر در دل تو گل گزرد گل باشی
وز بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزوے و حق کل ست اگر روزے چند
اندیشہ کل کنی کل باشی

(جامی، ۱۹۳۶، ص۷)

بالکل جیسے ایک خوردبین چھوٹی چیزوں کو بڑا کر دیتی ہے خوردبین کا چھوٹی چیزوں کو بڑا کر دینا ایک Instrumental support کے ساتھ وقتی طور پر حسی سطح پر اور ایک خاص دائرے کے اندر حقائق کو مکبر کر کے دکھانا ہے۔ لیکن بطور کل ہو کر تصورات اور خیالات کو اختیار کرنا ایک حقیقی حال ہے محض ظن یا تخیل نہیں ۔ کیونکہ مرتبہ کل میں جو بھی خیال آئے گا وہ کل کائنات کو محیط ہو گا۔ اللہ اور بندے کی حقیقت ایک ہے۔ اعتبار کی وجہ سے مرتبے الگ الگ ہیں۔ جب اعتبار اٹھ گیا تو پھر مرتبہ کل کے احکام نافذ ہوں گے۔ اعتبار وہی ہے جو تم نے تصور کر کے تسلیم کر لیا۔ ہر خوف و حزن ایک خیال سے جنم لیتا ہے۔ اور اس طرح کا خیال اس وقت جنم لیتا ہے جب بطور جزو ہو کر سوچا جائے۔ اگر کل کے دھیان میں کوئی تصور آئے گا تو وہ

خوف و حزن کو جنم دینے والا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس مرتبہ کی حفاظت شغل، وضو اور نماز کے ذریعے ممکن ہے۔ (قادری، ص ۱۰، ۱۱)

۲۔ وجود کے ساتھ ربط سے جب ہستی موہوم کی نفی ہوتی جاتی ہے تو خیالات کی اثر پذیری یوں بڑھتی ہے کہ خیالات کائناتی و آفاقی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ آفاقیت اور کائناتی انداز میں پیدا ہونے والے خیالات اس انداز سے اثر پذیر ہوتے ہیں کہ یہ خیالات عالم مثال سے عالم عنصریت اور عالم عنصریت سے عالم وجود میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ایسا خیال روح کی طرح لطیف اور قوی ہوتا ہے۔ یہ عالم اجسام میں اپنے اظہار اور اپنے وقوع پذیری کے لیے اپنے اسباب خود پیدا کرتا ہے اور ان اسباب کا پیدا ہونا پھر ان کے باہم جڑنے سے نتائج کا برآمد ہو جانا عقل اور حواس سے ماوراء معاملہ ہے۔ (قادری، ص ۱۶)

۳۔ مرتبہ کل میں خیالات کی اثر پذیری عالم مثال سے عالم مادیت کے رخ کی طرف ہی نہیں بلکہ عالم مادیت میں عالم مثال کے رخ کی طرف ہونے کا بھی امکان رکھتی ہے۔ جیسا کہ ظاہری زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے ایک تقدیری معاملے کو حضرت شیخ عبد القادر جیلانی ؒ نے عالم مثال کی طرف موڑ دیا۔ (قادری، ص ۲۳)

حاصل کلام

ہستی موہومہ سے نجات حاصل کر کے ذات حق کے وصل کے لیے اپنی ذات میں ذات حق کا اثبات کریں۔ لیکن اس بات کا آغاز اپنی ذات اور اپنے ارادے سے ہو گا یعنی اس عمل ہمارا ارادہ بہت اہم ہے۔ انیشیٹو ہم نے لینا ہے۔ اپنے مجاز کو حق کی حقیقت سے ہم نے بدلنا ہے۔ اس کے لیے صوفیاء کے سارے طریقے قرآن اور سنت پر مبنی ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا وضو ، غسل اور نماز کی بنیاد حدیث پاک ہے کہ کس طرح وضو اور نماز سے شعور پر لگی ہوئی پہلی ، دوسری تیسری اور چوتھی گرہ کھلتی ہے۔ کس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے زمین پر پاؤں مارا اور پھر غسل سے بیماریاں دور ہوئی۔ اسی طرح علی ہجویری کے ملامت کے ذریعے کشود کے منہج کی بنیاد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

وَعَن أَبِي كبشةَ الأنماريّ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «ثَلَاثٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَأُحَدِّثُكُمْ حَدِيثًا فَاحْفَظُوهُ فَأَمَّا الَّذِي أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ فَإِنَّهُ مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ وَلَا ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلِمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا إِلَّا زَادَهُ اللَّهُ بِهَا عِزًّا وَلَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ۔ (ترمذي، رقم:۲۳۲۵، مشکوۃ المصابیح، رقم: ۵۲۸۷)

ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: تین خصلتیں ہیں، میں ان پر قسم اٹھاتا ہوں اور میں تمہیں ایک حدیث بیان کرتا ہوں، تم اسے یاد کر لو، وہ چیزیں جن پر میں قسم اٹھاتا ہوں یہ ہیں: صدقہ کرنے سے بندے کا مال کم نہیں ہوتا، جس بندے کی حق تلفی کی جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کے بدلے میں اللہ اس کی عزت میں اضافہ فرماتا ہے، اور بندہ جب کسی سے سوال کرتا ہے تو اللہ اسے فقر میں مبتلا کر دیتا ہے۔

یہی صورتحال ذکر کی بھی ہے کہ ذکر سے غفلت آگاہی اور دوری قرب میں بدلتی ہے۔ سورہ مزمل میں ہے کہ رات کو نشو نما دینا مخالف عناصر اور رکاوٹوں کو روند دیتا ہے۔ تبتیل کے ساتھ ذکر کرنا اللہ کو انسان کا وکیل بنا دیتا ہے۔

صوفیا زندگی میں اس حال کو اعتدال کے ساتھ نافذ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے میں سب سے زیادہ صاحبان حکمت ہوتے ہیں۔ ابن عربی فرماتے ہیں:

والحكماء هم المقسطون ومن أوتى الحكمة فقد أوتي خيراً كثيرا وما وصفه الله بالكثرة فان القلة لا تدخله وسبب وصفه بالكثرة لان الحكم سارية في الموجودات لان الموجودات وضع الله ثم خلق الانسان وحمله الأمانة بان جعل له النظر في الموجودات والتصرف فيها بالأمانة ليؤدي كل ذي حق حقه كما ان الله أعطى كل شئ خلقه فجعل الانسان خليفة في الأرض دون غيره من المخلوقين فهو أمين على خلق الله فلا يعدل بهم عن سنة الله فالموجودات بيد الانسان أمانة عرضت عليه

فحملها فان أداها فهو الصوفي وان لم يؤدها فهو الظلوم الجهول والحكمة تناقض الجهل والظلم فالتخلق بأخلاق الله هو التصوف وقد بين العلماء التخلق باسماء الله الحسنى وبينوا مواضعها وكيف تنسب إلى الخلق ولا تحصى كثرة وأحسن ما تصرف فيه مع الله مع الله خاصة فمن يفطن وصرفها مع الله أحاط علماً بتصريفها مع الموجودات فذلك المعصوم الذي لا يخطئ أبداً والمحفوظ من ان يتحرك أو يسكن سدى جعلنا الله مع الصوفية القائمين بحقوق الله والمؤثرين جناب الله (ابن عربی، ۱۹۹۸، جلد دوم، ص ۲۶۴)

ترجمہ: اور حقیقی حکما وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کرنے والے (مقسطون) ہیں۔ اور جسے حکمت عطا کر دی گئی، تو بے شک اسے بہت بڑی بھلائی عطا کی گئی۔ (سورۃ البقرہ، آیت ۲۶۹) اور جب اللہ تعالیٰ کسی شے کو "کثرت" سے متصف فرمائے، تو پھر "قلّت" (کمی) اس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اس حکمت کو کثرت سے اس لیے بیان کیا گیا کیونکہ حکمت تمام موجودات میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اللہ نے موجودات کو پیدا فرمایا، پھر انسان کو خلق کیا، اور اسے امانت کا حامل بنایا، یعنی:

- اسے نظر (تفکر) عطا کیا تاکہ وہ موجودات میں غور کرے،
- اور ان میں امانت کے ساتھ تصرف کرے،
- تاکہ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرے۔

جیسے کہ اللہ نے ہر چیز کو اس کی تخلیق عطا فرمائی، اسی طرح انسان کو خلافت کے منصب پر فائز کیا، اور زمین پر اللہ کے سوا کسی اور مخلوق کو یہ مقام نہ دیا۔ پس انسان اللہ کی مخلوق پر امین ہے، اسے چاہیے کہ اللہ کی سنت سے انحراف نہ کرے۔ موجودات اللہ نے انسان کے سپرد بطور امانت کیے، اور جب وہ اس امانت کو درست طریقے سے ادا کرے، تو وہی صوفی ہے۔ اور اگر وہ اس میں خیانت کرے، تو وہ ظلوم و جہول ہے۔ کیونکہ حکمت ظلم اور جہالت کی ضد ہے۔ چنانچہ: اللہ کے اخلاق کو اپنانا ہی تصوف ہے۔ علمائے کرام نے بیان فرمایا ہے کہ:

- اللہ کے اسمائے حسنیٰ کے ذریعے کیسے اخلاق اختیار کیے جائیں،
- ہر اسم کو کس مقام پر اپنایا جائے،
- اور کس طرح وہ صفات مخلوق سے منسوب ہو سکتی ہیں۔

یہ اسماء اتنے کثیر ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ اور ان صفات کا سب سے بہترین تصرف یہ ہے کہ بندہ ان کو اللہ کے ساتھ خاص تعلق میں استعمال کرے۔ جس نے ایسا کیا، یعنی ان صفات کو اللہ کے ساتھ تعلق میں برتا، تو وہی شخص موجودات کے ساتھ تعامل میں بھی صحیح فہم رکھتا ہے۔ یہی وہ معصوم شخص ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا، اور جو اللہ کی حفاظت میں ہے کہ نہ وہ بے مقصد حرکت کرتا ہے، نہ سکون اختیار کرتا ہے۔ اللہ ہمیں ان صوفیاء میں شامل فرمائے، جو اللہ کے حقوق کی پاسداری کرنے والے اور اللہ کی حضوری کو مقدم رکھنے والے ہیں۔ (ابن عربی، ۱۹۹۸، جلد دوم، ص ۲۶۴)

یہ سفر موتوا قبل ان تموتوا یعنی مرنے سے پہلے مر جانے کا ہے — خودی کی نفی اور عرفانِ الٰہی کی طلب کا۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفانِ ذات اور عرفانِ خدا ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ 'علمِ تعین' (دنیاوی علم) اصل 'علمِ خدا' پر پردہ ہے، جسے کوشش سے ہٹانا ہے۔ علمِ خدا بے نام، بے صورت اور تشبیہات سے پاک ہے، جبکہ علمِ تعین نام، صورت اور مفروضات سے بھرا ہوا ہے۔ اسی کو دنیا کہتے ہیں، جو اصل نور پر حجاب بن جاتی ہے۔ پس دل سے دنیاوی علم کو ہٹانا اور علمِ خدا کو دل پر نقش کرنا ہی مقصد ہے۔ روح، بندہ اور حق — یہ سب جدا نہیں بلکہ ایک ہی ذات کی مختلف تجلیات ہیں۔ توحید کا یہی شعور، تصوف کے تربیتی نظام کا خلاصہ ہے۔ جب ہم اخلاص کے ساتھ عمل کریں، ہر عمل کو حق کا مظہر بنائیں اور دل کے آئینے سے حجاب ہٹا دیں، تبھی حقیقت کا مشاہدہ ممکن ہے:

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا!
'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے 'الااللّٰہ' کا

REFERENCES:

1. Iqbal, A. M. (1993). *The reconstruction of religious thought in Islam*. Lahore: Iqbal Academy Pakistan / Islamic Ideology Council.

2. Öztürk, E. (2022). *Eastern and Western ethicians: A critical comparison*. France: Livre de Lyon.
3. Varlik, S., & Camilleri, S. (Eds.). (2022). *Philosophical hermeneutics and Islamic thought*. Switzerland: Springer International Publishing.

۴. ابن عربی، الشیخ الاکبر محی الدین بن علی، الفتوحات المکیہ، جلد دوم، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۸ء

Ibn ʿArabī, Muḥyī al-Dīn. (1998). *Al-Futūḥāt al-Makkiyya* (Vol. 2). Beirut, Lebanon: Dār Iḥyāʾ al-Turāth al-ʿArabī.

۵. جامی، عبدالرحمن، لوائح جامی، مطبع منشی نولکشور، لکھنو، مارچ ۱۹۳۶ء

Jami, A. (1936, March). *Lawa'ih-e-Jami*. Lucknow: Matba' Munshi Naval Kishore.

۶. عطار، فرید الدین، منطق الطیر، فی التوحید باری تعالی جل و علا، حکایت عیاری کہ اسیر نان و نمک خوردہ رانکشت، اردیبھشت، ۱۴۰۳

ʿAṭṭār, Farīd al-Dīn. (1403 [2024/2025]). *Manṭiq al-ṭayr: Ḥikāyat-i ʿayyārī kih asīr-i nān o namak khurdah rā nakusht*. In *Fī al-tawḥīd Bārī Taʿālā Jalla wa ʿAlā*. [Iranian Solar Hijri Calendar: Ordībehesht].

۷. قادری، حضرت ظہور احمد قادری، جمال و کمال، بانی و مؤسس آستانہ فضل، سرگودھا

Qādri, Z. A. (n.d.). *Jamāl o Kamāl*. Sargodha: Āstāna Faḍl.

۸. رومی، مولانا جلال الدین رومی، فیہ مافیہ، فصل پنجاہ دوم، اسفند ۱۳۹۹

Rūmī, Jalāl al-Dīn. (1399 [2020/2021]). *Fīhi mā fīhi* (Fasl 52). [Iranian Solar Hijri Calendar: Esfand].

۹. رومی، مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی، دفتر دوم، بخش ۹، گمان بردن کاروانیان کہ بھیمۂ صوفی رنجور ست، آذر ۱۴۰۳

Rūmī, Jalāl al-Dīn. (1403 [2024/2025]). *Mathnawī Maʿnawī* (Daftar 2, Bakhsh 9: *Gumān burdan-i kārwāniyān kih bahīmah-yi ṣūfī ranjūrist*). [Iranian Solar Hijri Calendar: Āzar].

۱۰. ہجویری، سید علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب (ترجمہ: ابوالحسنات سید محمد احمد قادری)، مکتبہ شمس و قمر، لاہور، ۲۰۱۲ء

Hujwīrī, ʿAlī b. ʿUthmān. (2012). *Kashf al-maḥjūb* (Trans. Abū al-Ḥasanāt Sayyid Muḥammad Aḥmad Qādrī). Lahore: Maktabah Shams wa Qamar.